پروفیسر بختیار حسین صدیقی

اسلام کا فلسفۂ تعلیم

زندگی کی غایت کیا ہے؟ اور اس کے حصول کی بہترین تیاری کس بات پر مشتمل ہے؟ یہ ہیں وہ دو بنیادی سوال جن کا جواب دیے بغیر تعلیم کے مفہوم کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اسلام ان سوالوں کا کیا جواب دیتا ہے۔

زندگی کا خالق خدا ہے اور اس کا ارشاد ہے:

"ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے سوا کسی چیز کے لیے نہیں پیدا کیا (قرآن ۵۱: ۵۶)

عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک حقوق اللہ کی ادائیگی اور دوسری حقوق العباد کی ادائیگی۔ اللہ کے حقوق کی ادائیگی بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے ایک پائیدار روحانی اساس مہیا کرتی ہے۔ خدا سے غافل ہو کر بندوں کے حقوق ادا نہیں کیے جاسکتے اور نہ بندوں کی حق تلفی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جو لوگ پانچوں وقت کی نماز تو پابندی سے پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود یتیموں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ غربا و مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے اور ہمسایوں کو استعمال کی چیز بھی مانگے نہیں دیتے، قرآن کے الفاظ میں وہ اپنی نمازوں سے قطعی غافل ہیں اور دین کی سراسر تکذیب کرتے ہیں:

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی شخص ہے جو یتیموں سے بدسلوکی کرتا ہے اور (دوسروں کو) مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دلاتا (افسوس ہے ان نماز پڑھنے والوں پر جو (اگرچہ نماز پڑھتے ہیں پھر بھی) اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ (وہ لوگ جو نماز پڑھتے ہیں) استعمال کی چیزیں (غریبوں کو) نہیں دیتے اور استعمال کرنے سے (انھیں) منع کرتے ہیں۔" (قرآن، ۱۰۷)

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اپنا پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے۔"
صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! فلاں عورت رات بھر نماز پڑھتی ہے اور دن کو روزہ رکھتی ہے۔ احسان اور صدقہ کرتی ہے لیکن اپنے پڑوسیوں کو بدزبانی سے دکھ دیتی ہے۔ (آپؐ نے) فرمایا۔ اس کے لیے کوئی بھلائی نہیں ہے۔ وہ دوزخی ہے"۔

پس اللہ کے حقوق کی ادائیگی بندوں کے حقوق ادا کرنے کا واحد ذریعہ اور بہترین تیاری ہے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب کہ معاشرے کی بنیاد مادی علائق و فوائد کے بجائے اللہ کی حاکمیت پر استوار کی جائے۔ اسی بات کی تلقین کرنے اور عملی طور پر اس کی مثال قائم کرنے کے لیے رسول اکرمؐ کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ آپؐ کا ارشاد ہے :

"لوگو! بے شک تمھارا رب ایک ہے، اور بے شک تمھارا باپ ایک ہے۔ اور یہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سفید فام کو سیاہ فام پر اور سیاہ فام کو سفید فام پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقوے کے"۔

تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ نے تقوے ہی کی فضیلت کی بنیاد پر زبان، رنگ، خون نسل اور مہاجر و انصار اور امیر و غریب کے تمام امتیازات اور تعصبات سے مدینہ منورہ میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس کی روح رواں اللہ کی حاکمیت اور آدمیت کے احترام کا جذبہ تھا۔

یہ ہے اسلام کی رُو سے انسان کی تخلیق کا مقصد اور اس کے حصول کی بہترین تیاری تعلیم چونکہ ہمیشہ مقصدِ حیات کے تابع ہوتی ہے، اس لیے اسلام کی رو سے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انسان کو اللہ کے حقوق ادا کرنے کے قابل بنائے جو اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی لازمی شرط ہے۔ یعنی وہ اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر ایسا معاشرہ قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں مدد دے جس میں رواداری، معاشرتی انصاف، حریت، اخوت اور محبت کا بول بالا ہو۔

فلسفیانہ اساس

اسلام کی اصل دلچسپی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تہذیب و اصلاح سے ہے۔ اس کی جملہ تعلیمات کا تعلق زندگی کے ان ہی دو شعبوں سے ہے۔ سائنس کے قوانین یا فلسفے

کے مسائل سے قرآن نے کہیں بحث نہیں کی ہے۔ یہ معاملات اس نے انسانی فکر، تجربے اور مشاہدے پر چھوڑ دیے ہیں۔ البتہ ہمیں اس طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے بار بار مشاہدے کرنے، سوچنے غور و فکر کرنے اور عقل سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔

دنیا کے آغاز، انجام اور اس کی تخلیق کے مقصد کے بارے میں ہر شخص کا شعوری یا لاشعوری طور پر اپنا ایک عقیدہ ہوتا ہے جس کا عکس ہمیں اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظر آتا ہے۔ عقائد کے اس مجموعے کو اس شخص کا فلسفہ کہتے ہیں۔ انسان کے متعلق سب سے زیادہ اہم اور عملی اعتبار سے قابلِ لحاظ چیز اس کا فلسفہ ہے۔ یہ اس کی سیرت و کردار کو سمجھنے کی کنجی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ شخصی فلسفہ اصل منظم فلسفے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ اختلاف چار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے:

۱۔ شخصی فلسفے کی زبان روزمرہ کی آسان اور عام فہم زبان ہوتی ہے، جبکہ منظم فلسفے کی زبان دقیق، مجرد اور اصطلاحی ہوتی ہے جسے عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔

۲۔ شخصی فلسفہ زیادہ تر مضمرات پر مشتمل ہوتا ہے جس طرح بیج میں تناور درخت پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح شخصی فلسفے میں فلسفیانہ افکار پوشیدہ ہوتے ہیں جن میں ایک مکمل فلسفیانہ نظام بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ منظم فلسفے میں افکار و تصورات، اصول اور کلیے مضمر نہیں ہوتے بلکہ بالکل عیاں اور واضح ہوتے ہیں۔

۳۔ شخصی فلسفے میں افکار ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، ان میں تسلسل اور مطابقت نہیں پائی جاتی بلکہ اکثر ان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ منظم فلسفہ افکار کا ایک مربوط نظام ہوتا ہے اس میں منطقی ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے ہم آہنگ ہوتا ہے، اس کی تردید یا تکذیب نہیں کرتا۔

۴۔ منظم فلسفہ شعوری طور پر ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے اور زندگی کی گتھی سلجھانے کے لیے وسعتِ نظر سے کام لیتا ہے۔ شخصی فلسفے کا مطمحِ نظر تنگ و محدود ہوتا ہے اور وہ ترقی کی منازل لاشعوری طور پر طے کرتا ہے۔

شوپنہائر (SCHOPENHAUER) نے مذہب کو "عوام کی مابعد الطبیعیات" کہا ہے جو شخصی

فلسفے کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اس مفہوم میں اسلام ہمارا فلسفۂ حیات ہے۔ دین کی حیثیت سے اس کی اپنی مخصوص اقدار، عقائد اور اصول ہیں جنھیں اگر منظم فلسفے کی زبان میں جو وجودیات، علمیات، کونیات اور قدریات پر مشتمل ہے، بیان کیا جائے تو ان کی شکل کچھ اس طرح بنے گی:

۱۔ وجودیات (ONTOLOGY) یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو زندگی یا وجود کی ماہیت سے بحث کرتی ہے اور اس بات کی تحقیق کرتی ہے کہ آیا اس عالم کوئی ایک جوہر ہے، یا ایک سے زیادہ جواہر (SUBSTANCES) اور ان کی نوعیت مادی ہے یا روحیتی۔ قرآن دینی عینیت (IDEALISM) یا روحیت کا داعی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ:

"ہر شے خدا کی طرف سے آئی ہے اور اسی کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔" (قرآن، ۲: ۱۵۶)

وجود مطلق صرف خدا کی ذات ہے، باقی ہر شے اپنے وجود کے لیے اس کی محتاج ہے۔ حقیقتِ اولیٰ ایک ہے اور صرف ایک اور یہ ایک حقیقت اپنی نوعیت میں خالصتاً روحانی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وہ ذات پاک جس کا نام اللہ ہے ایک ہے۔ وہ معبود برحق بے نیاز ہے۔ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ (قرآن، ۱۱۲)

یہ پاک اور بے نیاز خدا کائنات کی وجودیاتی اساس ہے۔ انسان کا ادراک، احساس، اور ارادہ جب اس عقیدے کی تفسیر بن جائے تو وہ خود یاس (قرآن، ۳۹: ۵۶) حزن اور خوف (قرآن، ۲: ۶۲) کی اخلاقی بیماریوں سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لیے اس کا وجود رواداری، اخوت اور محبت کا پیغام بن جاتا ہے۔ اس طرح اس میں وہ زبردست اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے جسے کوئی طبعی قوت زیر نہیں کر سکتی۔

۲۔ علمیات (EPISTEMOLOGY) یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو علم کے امکان، اس کی ابتدا، ماہیت اور حدود سے بحث کرتی ہے۔ اسلام کی رو سے علم خدا کی صفت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

"خدا نے آدم کو اشیا کے نام سکھائے۔" (۲: ۳۱)

انھیں چیزوں کی حقیقت کا علم عطا کیا، اور یہی فرشتوں پر ان کی فضیلت کا باعث بنا۔ علم حق کا سرچشمہ قرآن ہے جو وحی کی صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ دوسرے الفاظ میں حقیقی علم کا ذریعہ وحی ہے جس کا سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ختم ہوگیا۔ وحی کے علاوہ قرآن نے آنکھ، کان اور دل (فؤاد) کو (قرآن: ۱۶: ۱۰۸، ۲۳: ۷۸، ۳۲: ۹، ۶۷: ۲۳) یعنی اس نے ذاتی مشاہدے، دوسروں کی روایت، تفکر اور فطری وجدان کو بھی علم حق کا ذریعہ قرار دیا ہے اور ہمیں بار بار مشاہدہ کرنے، سوچنے اور عقل سے کام لینے کی تاکید کی ہے:

"بے شک زمین اور آسمان کی تخلیق اور رات اور دن کے آنے جانے اور دریا میں کشتیوں کے چلنے جس میں لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں، اور بارش جو خدا تعالیٰ آسمان سے بھیجتا ہے جس سے مردہ زمین میں پھر سے جان پڑ جاتی ہے، اور زمین پر ہر قسم کے مویشی پیدا کرنے اور ہواؤں کا رُخ بدلنے اور بادل جو زمین اور آسمان کے درمیان مسخر ہیں — ان سب چیزوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔" (قرآن، ۲: ۱۶۴)

مشاہدے اور غور و فکر پر زور دینے سے قرآن کا مقصود ہمیں یہ بتانا ہے کہ وحی کے علاوہ استقرائی علوم بھی اپنی جگہ پر علم حق کا ذریعہ ہیں۔ آپ باری باری سیب، پتھر اور مٹی کے ڈھیلے کو آسمان کی طرف پھینکیں۔ کچھ دور اوپر جا کر وہ سب ایک ایک کر کے زمین پر گر پڑیں گے۔ ان حقائق کے مشاہدے سے نیوٹن نے ایک قانون اخذ کیا جسے قانون ثقل قوت کہتے ہیں۔ قرآن اس قانون اور اس جیسے دوسرے قوانین فطرت کو میکانکی قوانین کی بجائے "اللہ کی سنت" قرار دیتا ہے جس میں کبھی "تبدیلی واقع نہیں ہوتی" (۴۸: ۲۳)

فطرت خدا کی تخلیق ہے اس لیے اس کے قوانین لازمی طور پر صانع فطرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ علم حق کی ابتدا حواس سے ہوتی ہے لیکن اس کی آخری منزل وحی اور وجدان سے حاصل ہونے والا علم ہی ہے جو حسی اور فکری شعور میں نہیں سماتا۔

۳۔ کونیات۔ (COSMOLOGY) یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو دنیا میں موجود اشیا کی تخلیق، ان کی شکل و صورت، اور ان میں آپس کے باہمی تعلق سے بحث کرتی ہے:

قرآن کی رُو سے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے ان سب کا خالق خدا ہے جو دنیا

سے انتہائی بلند و بالا عرش پر متمکن ہے۔ اس نے چھ دن میں عدم سے دنیا کو پیدا کیا اور ہر شے کو اس کی شکل عطا کی۔ (قرآن، ۷: ۵۴، ۱۰: ۳، ۵۷: ۴، ۲۵: ۵۹، ۳۲: ۴)۔

اسی کی بالادستی میں اب بھی اس کا انتظام چل رہا ہے۔ وہ دنیا کا خالق ہی نہیں، اس کا رب اور پروردگار بھی ہے۔ ایک دن اس کے حکم سے یہ دنیا فنا ہو جائے گی۔ قیامت آئے گی، مردے قبروں سے اپنا اپنا اعمال نامہ لیے اٹھیں گے۔ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ نیکی کا اسے پورا پورا اجر ملے گا اور ہر برائی کی پوری پوری سزا۔ اور کسی شخص کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

انسان کی پیدائش کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ خدا نے مٹی سے آدم کا پتلا تیار کیا۔ (قرآن، ۳۲: ۷، ۳۸: ۷۱) اور پھر اس میں اپنی روح پھونکی۔ (۳۲: ۹، ۳۸: ۷۲)

جسم اور روح ایک دوسرے کی ضد ہیں اور بظاہر ان میں باہم رابطے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اللہ کے حکم سے یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس کی مداخلت ان دونوں میں تعامل (INTERACTION) کا موقع فراہم کرتی ہے اور ہمارے ذہنی اور جسمانی اعمال میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ جدید مفکرین میں گیولینا کس (GEULINEX) اور میلی برانش (MALE BRANCHE) بھی اسی عقیدے کے حامی ہیں۔ انھوں نے اسے موقعیت (OCCASIO NALISM) کا اصطلاحی نام دیا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام کی رو سے دنیا میں ایک اصولِ وحدت کارفرما ہے۔ یہ اصول دنیا سے باہر ہے اس کے اندر نہیں۔ اسی کی حاکمیت میں دنیا کا نظام چل رہا ہے اور وہ اس میں پیش آنے والے ہر واقعے سے باخبر ہے۔ یہ کوئی بے غرض اور بے جان اصول نہیں ہے جسے انسان کی فلاح اور بھلائی سے دلچسپی نہ ہو۔ یہ اصول انسان کا اپنا ہی خدا ہے جسے اپنے بندوں سے محبت ہے، جو ان کی فلاح کا خواہاں ہے، جو ان کی درد بھری پکار سنتا ہے اور انھیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔ شخصی خدا کے اس نظریے کو فلسفے کی اصطلاح میں وحدانیت (THEISM) یا ماورائی غائتیت (TRANSCENDENTAL TELEOLOGY) کا نظریہ کہتے ہیں۔

۴۔ قدریات (AXIOLOGY): یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو زندگی کی اعلیٰ اقدار مثلاً دینی

اقدار، اخلاقی اقدار، جمالیاتی اقدار اور معاشرتی اقدار کے ماخذ اور ماہیت سے بحث کرتی ہے۔ قرآن کی رُو سے خیر، خوبی اور سچائی کی تمام اقدار مطلق (ABSOLUTE) اقدار ہیں، اضافی (RELATIVE) اقدار نہیں۔ ان کی حیثیت معروضی (OBJECTIVE) ہے، موضوعی (SUBJECTIVE) نہیں۔ کیونکہ ان کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے، انسان کی پسند یا ناپسند نہیں۔ خدا نے جس بات کا حکم دیا ہے وہ اچھی ہے، جس سے منع کیا ہے وہ بری ہے۔ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم خدا کے احکام کی تعمیل کریں۔

پہلے نفسیات فلسفے ہی کا ایک حصہ تھی لیکن اب اس کا شمار تجربی علوم میں ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا ذہن یا روح کے متعلق علم سے ہوئی۔ روح کیسے پیدا ہوئی؟ یہ فانی ہے یا غیر فانی؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ وہ کون سے اعمال ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں؟ اس کا جسم کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ یہ تمام مسائل اس کا موضوع بحث تھے۔ قرآن کی رو سے روح کے بارے میں انسان کو اس کا بہت کم علم دیا گیا ہے۔ (۱۷:۸۵)

اس کے حکم سے وہ ایک معینہ مدت کے لیے جسم کو اپنا مسکن بناتی ہے اور پھر اسی کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔ جسم اور روح کے اس مرکب کو قرآن نے نفس کہا ہے۔ اسی کی تربیت اور اصلاح سے تعلیمی عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے پہل نفس جسمانی احتیاجات اور خواہشات کا مرقع ہوتا ہے۔ اس کا میلان بدنی لذات کی طرف ہوتا ہے جو اسے برائی میں ملوث کرتا ہے۔

قرآن نے اس کی اس حالت کو نفس امارہ کہا ہے: (۱۲:۵۳)

رفتہ رفتہ روح بیدار ہوتی ہے جو نفس کو جسمانی لذات کی طمع پر سرزنش کرتی ہے اور وہ کشمکش اور تصادم رونما ہوتا ہے جو اخلاقی جدوجہد کی لازمی شرط ہے۔

قرآن نے نفس کی اس حالت کو نفس لوامہ سے تعبیر کیا ہے۔ (۷۵:۲)

آخر میں جسم روح کی بالادستی کو تسلیم کر لیتا ہے۔ کشمکش اور تصادم کی صورت ختم ہو جاتی ہے اور نفس وہی کچھ کرتا ہے جس میں خدا کی خوشنودی ہوتی ہے۔ نفس کی اس حالت کو قرآن نے نفس مطمئنہ قرار دیا ہے۔ (۸۹:۲۷)

یہ ہے منظم فلسفے کی زبان میں اسلامی عقائد اور اقدار کا خلاصہ۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اس فلسفۂ حیات کی روشنی میں تعلیمی عمل کے کیا اغراض و مقاصد متعین ہوتے ہیں؟

تعلیمی اغراض و مقاصد

کائنات کی وجودیاتی اساس خدا ہے ۔ وہی اس کا خالق ہے اور رب بھی ۔ اس نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے ۔ اس لیے تعلیمی عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے روحانی نصب العین پر مرکوز ہو ۔ اس نصب العین کے حصول کی دو شرائط ہیں پہلی شرط یہ ہے کہ تعلیم فرد کو خالق اور رب کی حیثیت سے اللہ کے حقوق ادا کرنے کے قابل بنائے ۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اسے اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے مستعد کرے ۔ بندوں کی خدمت سے خدا خوش ہوتا ہے ، لیکن بندوں کی خدمت وہی شخص کر سکتا ہے جو خدا کی خوشنودی کا خواہاں ہو ۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ۔ پس تعلیم کا مقصود نہ صرف اچھے افراد پیدا کرنا ہے اور نہ ہی صرف اچھے شہری بلکہ بیک وقت ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنا ہے ، اور یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر رنگ ، خون اور نسل کے امتیازات سے پاک ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو حریت ، رواداری ، اخوت ، اور محبت کا مرقع ہو ۔ صرف ایسے معاشرے ہی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد بطریقِ احسن ادا کیے جا سکتے ہیں ۔

تعلیمی عمل

تدریسی مواد کے ذریعے تعلیم جس فعالیت (ACTIVITY) کو جنم دیتی ہے وہ اپنا عمل شاگرد کے ذہن پر کرتی ہے ۔ اس فعالیت کو تعلیمی عمل کہتے ہیں ۔ یہ عمل ہی فی الحقیقت تعلیم ہے ۔ استاد ، نصاب اور شاگرد اس کے تین ارکان ہیں اور مدرسہ وہ مخصوص جگہ جہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ آئیے ! اب دیکھیں کہ تعلیمی عمل کے ان ارکانِ ثلاثہ اور مدرسے کے متعلق اسلام نے کیا تصور پیش کیا ہے ؟

۱ ۔ مدرسہ ۔ مسجد نبوی اسلام کی سب سے پہلی درس گاہ تھی ، جہاں اسلامی ثقافت نے جنم لیا اور جہاں سے تہذیب و تمدن کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں ۔ ثقافت ایک روحانی حقیقت ہے ۔ خدا اس کے ذریعے اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے ۔ انسان فطرتاً ثقافت کا محتاج ہوتا ہے ۔ جسمانی طور پر دنیا میں آ جانا اس کے لیے کافی نہیں ۔ اگر انسان کو انسان بنانا مقصود ہے تو ثقافتی طور پر جنم لینا اس کے لیے ناگزیر ہے ۔ ایک منظم ادارے کی حیثیت سے یہ

فرض صرف مدرسہ ہی انجام دے سکتا ہے۔ وہ بچے پر یہ واضح کرتا ہے کہ انسان ہونے کے کیا معنی ہیں، اور وہ اساس مہیا کرتا ہے جس سے حقیقت اولیٰ کی ماہیت کے بارے میں استدلال کیا جا سکتا ہے تعلیم خدا نے انسان پر فرض کی ہے کیونکہ یہ ثقافتی فرائض انجام دیتی ہے اور چونکہ زندگی کی اساس روحانی ہے اور ابدی۔ مدرسہ ثقافت کا محافظ ہے۔ وہ ملّی عقائد اور اقدار کو نئی نسل میں منتقل کرتا ہے، اسے انسان کے روحانی تقاضوں اور ثقافتی ضرورتوں نے جنم دیا ہے۔

۲۔ شاگرد۔ بظاہر شاگرد ایک جسم ہے لیکن خدا نے اس میں ایک روح پھونکی ہے اس کے جسم کے قالب میں ایک روح ہے جس کی تخلیق خدا نے کی ہے۔ اس کی شخصیت کا احترام وہ اعلیٰ قدر ہے جس پر تعلیم کی بنیاد استوار ہے۔ شخصیت کے احترام سے مراد یہ ہے کہ تعلیم میں خلوص محبت کا جذبہ کارفرما ہو۔ سختی و درشتی سے بچے کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ وہ خود اپنی نظر میں گر جاتا ہے اور تعلیم سے استفادہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاگرد سے اگر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہو جائے تو استاد کیا کرے؟ غزالی کے نزدیک ایسی صورت میں استاد کا فرض ہے کہ وہ شاگرد کو تعریض و کنایہ سے سمجھانے کی کوشش کرے، شفقت اور محبت کا رویّہ اختیار کرے، کھل کر اس کی غلطی کو اس کے سامنے واضح نہ کرے۔ اور نہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے، کیونکہ اس طرح دل سے ہیبت اٹھ جاتی ہے، اور شاگرد لغزشوں پہ اتر آتا ہے۔ جس چیز سے انسان کو سختی سے منع کیا جائے وہ اس پہ اور آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ترغیب لغزش ابھرتی ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر لوگوں سے کہا جائے کہ مینگنی کو نہ توڑو، تو وہ اسے توڑ کر رہیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں جو روکا گیا ہے تو ضرور اس میں کوئی بات ہے۔ آدم سے لغزش اسی وجہ سے ہوئی۔ تعریض و کنایہ میں یہ خوبی ہے کہ اس سے ذہین شاگرد غور و فکر کے عادی ہو جاتے ہیں اور جو غیرت دلانے والے دقیق معانی اس میں پنہاں ہوتے ہیں انھیں معلوم کر کے انھیں خوشی ہوتی ہے اور وہ اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ استاد کو ان کی ذہانت اور فطانت کا پورا پورا پاس ہے[۱]

۱؎ غزالی، احیاء علوم الدین، اردو ترجمہ مذاق العارفین از مولوی محمد احسن مطبع نولکشور لکھنؤ ص ۳۲، ج ۱، جلد اول ص ۹۰

ابن خلدون کے نزدیک "تعلیم میں سختی برتنا سخت مضر ہے خصوصاً چھوٹے بچوں پر، کیونکہ یہ ان کی نااہلی کی دلیل ہے۔ اس سے ان کی طبیعت بجھ جاتی ہے۔ دل سے امنگ، خوشی اور بشاشت فرار ہو جاتی ہے۔ متعلم جھوٹ اور مکر و فریب سے کام لینے لگتا ہے۔ اس کی طبیعت میں سے حمیت اور غیرت کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ یہود قوم کو دیکھیے، ظلم و تشدد کی فضا میں پلنے کی وجہ سے خباثت ان کی طبیعت میں بیٹھ گئی ہے، اور وہ خبث نفس اور مکر و کید میں ضرب المثل ہو گئے ہیں۔"[۱]

شاگرد جو کچھ بن سکتا ہے اس کی صلاحیت بالقوۃ اس میں موجود ہوتی ہے۔ تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اسے قوت سے عمل میں لے آئے، جو چیز پوشیدہ ہے اسے ظاہر کر دے۔ شاگرد کوئی پہلے سے بنی بنائی چیز نہیں ہے۔ وہ کچھ بننے کے عمل کی آماجگاہ ہے، وہ تغیر کے عمل کا محل ہے۔ اس میں جو کچھ بالقوۃ موجود ہوتا ہے تغیر کا عمل اسے قوت سے فعل میں لے آتا ہے۔ انسان فطرتاً اچھا ہے نہ برا، وہ کافر ہے نہ یہودی نہ عیسائی۔ اس کے ماں باپ اسے کافر، یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔ تربیت اور اکتساب سے وہ باپ دادا کا مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ تعلیم اور ماحول سے وہ اچھا یا برا انسان بنتا ہے۔

شاگرد ایک روح ہے، وہ خود خدا کی طرف اقدام کرتا ہے، وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو خدا دو قدم اس کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ روحانی اخذ و جذب کے اس عمل کا مرکز جس پر تعلیم مشتمل ہے، ایک نہاں خانہ ہے، جس میں طالب علم خود رہتا ہے۔ استاد اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اپنے اثر و نفوذ سے وہ اس کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیتا ہے۔ اس طرح جو ردِ عمل شاگرد میں پیدا ہوتا ہے اس پر اس کی ساری تعلیم منحصر ہے۔ شاگرد خود اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ تعلیمی تجربات انتہائی شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں۔ دنیا سے متعلق شاگرد کے ردِ عمل کا سرچشمہ خود اس کا ذہن ہے جس کی نشو و نما کا دار و مدار اس کی اپنی خود فکری پر ہے۔ شاگرد خود اپنی رہنمائی کرتا ہے، اس کا ذہن خود مقاصد کی تشکیل کرتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی کوشش

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون، مترجمہ مولانا سعد حسن خان یوسفی کراچی، ص ۵۶۳۔

کرتا ہے تعلیم پوشیدہ صلاحیتوں کے قوت سے فعل میں آنے کا ایک سلسلہ ہے جو ذہن کی نشوونما کے مختلف مدارج میں رفتہ رفتہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ تعلیم باہر سے کوئی چیز شاگرد کے ذہن میں داخل نہیں کرتی بلکہ جو چیز اس کے ذہن یا دل میں مضمر ہوتی ہے اسے باہر لے آتی ہے۔

تعلیمی عمل نفس کی اپنی اخلاقی جدوجہد پر مشتمل ہے جس کا مرکز نہاں خانۂ دل ہے۔ نفس کی معرفت اس جدوجہد کی ابتدا ہے اور انتہا بھی، کیونکہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا۔ نفس کی معرفت کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ نفس امارہ کا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں جسمانی احتیاجات اور خواہشات کی حکمرانی ہوتی ہے اور نفس ہمہ تن ان میں غرق ہوتا ہے اور برائی کی طرف راغب۔ دوسرا مرحلہ نفس لوّامہ کا ہے۔ اس مرحلے میں روح بیدار ہوتی ہے جو برائی سے روکتی ہے اور اخلاقی جدوجہد کو تقویت پہنچاتی ہے۔ تیسرا مرحلہ نفس مطمئنہ کا ہے جو اخلاقی جدوجہد کی معراج ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں روح جسم کو اپنا مطیع بنالیتی ہے۔ عقل فطرت کو مسخر کرلیتی ہے اور کشمکش و تصادم کی صورت ختم ہوجاتی ہے۔ بندہ خدا سے راضی ہوجاتا ہے اور خدا بندے سے، یہ اللہ سے تقرب کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

۳۔ استاد۔ مسجد نبویؐ اسلام کی پہلی درس گاہ تھی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پہلے معلم۔ یہ درس گاہ دینی عینیت کا گہوارہ تھی، اس لیے اس میں معلم کی حیثیت اساسی اور مرکزی تھی۔ عینیتی نظام تعلیم میں استاد ہی تعلیم کے لیے مناسب ماحول کا انتخاب کرتا ہے۔ موزوں موادِ تدریس مہیا کرتا ہے اور شاگرد پر سب سے زیادہ اہم اثر ڈالنے والی واحد شخصیت کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ثقافتی ورثے کے محافظ کی حیثیت سے وہ شاگرد کے لیے حقیقت مجسم ہوتا ہے جس کی شخصیت میں ساری کائنات سمو دی گئی ہو۔ شاگرد اس حقیقت مجسم کا بے انتہا ادب، احترام اور تعظیم کرتا ہے کیونکہ یہی وہ سب سے بڑی قدر ہے جس پر تعلیم کی بنیاد استوار کی جاتی ہے۔ جس طرح استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ شاگرد کی شخصیت کا احترام کرے اسی طرح شاگرد کے لیے لازم ہے کہ وہ استاد کا ادب و احترام کرے۔ ایصال و ابلاغ (COMMUNICATION) کا نام تعلیم ہے اور یہ عمل اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا،

جب تک کہ شاگرد اور استاد دونوں کے دل ایک دوسرے کے لیے احترام کے جذبے سے لبریز نہ ہوں۔ خلوص اور محبت تعلیمی عمل کی روح رواں ہیں۔

استاد خدا کی طرف سے ایک مبلغ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ شاگرد کی سمجھ سے بالاتر بات نہ کرے اور نہ درس و تدریس کا کوئی معاوضہ لے۔ اگر وہ اپنا صحیح اور پورا کردار ادا کرے تو وہ ثقافت کا محافظ اور روحانی ترقی اور دینی تموّل کا ضامن ہے۔ اس کے پیشے کا تقاضا خودستائی اور خودنمائی نہیں بلکہ شاگردوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اپنے آپ کو غرق کر دینا ہے تاکہ جو کچھ ان کے اندر بالقوۃ موجود ہے وہ بالفعل ظہور میں آجائے۔ اس کا کام طلبا میں اپنے نصب العین کے حصول کی لگن اور شوق پیدا کرنا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ ان کے بڑھتے ہوئے احساسِ ذات کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے کیونکہ یہ احساس ہی تعلیمی عمل کی روح ہے۔

طلبا استاد کے اثر کو نقل کے ذریعے قبول کرتے ہیں نقل کرنا چونکہ ایک فطری عمل ہے لہٰذا استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرے اور اپنے کردار کی مثال پیش کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ نقل کرنا سراسر ایک تعلیمی عمل ہے۔ اس سے شاگرد میں ایک نئی قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے۔ استاد سے گہرا شخصی رابطہ قائم کرنے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی تقلید کرنے سے ہی اس میں ندرتِ فکر و عمل پیدا ہوتی ہے۔ اس کی تقلید کر کے ہی وہ اس سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ پس استاد کے لیے لازم ہے کہ اس کا علم جامع ہو اور اس کا کردار مثالی، تاکہ شاگرد میں اس کے ہر فعل کو نقل کرنے کی تحریک پیدا ہو۔ اس کے قول و فعل میں تضاد ہرگز نہ ہو ورنہ شاگرد پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

۴۔ نصاب۔ بچوں کو یہ حق قطعی نہیں پہنچتا کہ زندگی کا راستہ منتخب کرنے کے لیے انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ انھیں ہدایت کا راستہ دکھانا اور گمراہی سے بچانا ہمارا فرض ہے، انھیں اس ورثے سے فائدہ اٹھانے کا حق پہنچتا ہے جو نسلِ انسانی انھیں پیش کر سکتی ہے۔ والدین اور اساتذہ اگر اسے ان کے سامنے پیش نہیں کریں گے تو پھر یہ مسخ ہو کر دوسرے ذرائع سے ان تک

پہنچے گا۔ بچہ بھوکا نہیں رہے گا۔ اچھی غذا نہ ملے تو پھر خراب غذا کھائے گا۔ انسان کا مثالی کردار اور مثالی معاشرے کی خصوصیات نسلِ انسانی کا وہ ورثہ ہیں جس کا مدرسے کو نئی نسل میں منتقل کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نصابِ تعلیم ہمیشہ فلسفۂ حیات کے تابع ہوتا ہے۔ کوئی نصاب شاگرد نواز ہوتا ہے، کوئی مضمون نواز، کوئی معاشرہ نواز اور کوئی نصب العین نواز۔ اسلام کی رُو سے شاگرد ایک روح ہے۔ استاد خدا کی طرف سے مبلغ ہے اور خدا کی خوشنودی وہ نصب العین ہے جس پر نصاب کو مرکوز ہونا چاہیے۔ پس قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، کلام، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مثالی کردار اور اس مثالی معاشرے کی خصوصیات جو آپ نے مدینے میں قائم کیا تھا نصاب کی بنیادی اکائی ہیں۔ فکر، احساس اور عمل کی دنیا میں اسلاف کے کارنامے ہی ہمارے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ سیرت النبی، سیرت صحابہ، آئمہ عظام اور مشائخ کرام کے نقش قدم پر چل کر ہی ہم اچھے فرد اور اچھے شہری بن سکتے ہیں اور ایسا معاشرہ قائم کر سکتے ہیں جس میں رواداری، اخوت اور محبت یعنی آدمیت کا بول بالا ہو۔

اسلام صرف کتابی مطالعے کو کافی نہیں سمجھتا۔ فطرت یعنی انفس اور آفاق کو بھی اس نے علم کا ذریعہ قرار دیا ہے اور ہمیں بار بار مشاہدے، تعقل اور تفکر کی دعوت دی ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

"ایک نشانی ان کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی کے لیے ممکن ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے۔ سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔" (۳۶: ۴۰)

"ہم جلد ہی لوگوں کو آفاق اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔" (۴۱: ۵۳)

"اور اہلِ یقین کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں اور ان کے انفس میں بھی۔ تو پھر تم ان کا مشاہدہ کیوں نہیں کرتے۔" (۵۱: ۲۱)

"جسے حکمت دی گئی، بے شک اسے خیرِ کثیر دی گئی۔" (۲: ۲۶۹)

انسان روح اور جسم کا ایک مرکب ہے۔ اسلام نے ان دونوں کو اپنے نظام تعلیم میں جگہ دی ہے۔ عینیت اور فطرتیت دونوں اس کے دامن میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف عینیت کا علم بردار ہے اور نہ صرف فطرتیت کا، بلکہ ان دونوں کا ایک کامیاب امتزاج ہے۔ کامیاب سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام فطرتیت کو بے لگام نہیں چھوڑنا چاہتا۔ وہ اسے اپنی دینی عینیت کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ فطرت یعنی زمین و آسمان کے مشاہدے پر بے شک اس نے زور دیا ہے۔ طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، اراضیات، موسمیات، بحریات وغیرہ کے علوم استقرائی مشاہدے ہی کا ثمر ہیں، لیکن ان علوم سے حاصل ہونے والی بے پناہ طبیعی قوت کو وہ قدرت کی اندھی یا میکانکی قوت سمجھنے کے خلاف ہے۔ فطرت کا مشاہدہ اگر صانع فطرت تک رہنمائی نہیں کرتا تو وہ ادھورا، ناقص اور نامکمل ہے۔ لیکن استقرائی حدود میں رہتے ہوئے وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت (فطری وجدان) کی بھی ضرورت ہے، جس کے بغیر مظاہر قدرت میں اللہ کی نشانیاں ہرگز نظر نہیں آسکتیں۔ قرآن نے نفس کی اپنی اخلاقی جدوجہد اور اس کے باہر زمین اور آسمان میں آیاتِ الٰہیہ دکھانے کا جو وعدہ کیا ہے، اس کی اصل منشا یہی ہے کہ فطرتیت کو عینیت کا تابع بنایا جائے، بصارت کو بصیرت کا جامہ پہنایا جائے اور استقرائی علوم سے حاصل ہونے والی بے پناہ طبیعی قوت کو اخلاقی قوت کے ماتحت رکھا جائے تاکہ وہ تباہی و ہلاکت کے بجائے دنیا کے لیے سراسر رحمت بن جائے۔

پس دینی علوم کے ساتھ ساتھ استقرائی علوم بھی اسلام کے نصب العین نوازنصاب کا لازمی حصہ ہیں۔ عمرانی علوم میں قرآن نے تاریخ کا بالتصریح ذکر کیا ہے اور اسے "ایام اللہ" (۱۴: ۵) کا نام دیا ہے۔ جس طرح دن اور رات کے آنے جانے، سمندروں میں کشتی چلنے، بادلوں سے پانی برسنے اور زمین سے اناج اگنے میں ہوشمندوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں، اسی طرح قوموں کے عروج و زوال میں اربابِ دانش کے لیے اخلاقی سبق ہے کہ قوموں کے کردار پر ہمیشہ اجتماعی حیثیت سے حکم لگایا جاتا ہے اور یہ کہ ان کی بداعمالیوں کی سزا انھیں اس دنیا میں ملتی ہے۔ اہلِ بصیرت اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اللہ کا قانون کبھی

بدلتا نہیں، خواہ اس کا تعلق طبیعیات سے ہو یا تاریخ سے، قدرتی مظاہر سے ہو یا اقوام کے کردار سے۔

استقرائی اور عمرانی علوم کو نصاب میں شامل کرنے کا فلسفہ یہ ہے کہ آرٹ، سائنس اخلاق، تاریخ، سیاسیات وغیرہ میں انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ صرف اس حد تک اس کی ترقی کا پیمانہ ہے جس حد تک اس نے خود اپنے آپ کو ذہن مطلق کا آئینہ دار بنایا ہے۔ آرٹ کے ذریعے انسان کی رسائی حسن مطلق تک ہوتی ہے۔ سائنس ذہن مطلق کی عکاسی کرتی ہے جتنا اور جیسا کچھ وہ اس مادی دنیا میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اخلاقی اقدار خیر مطلق کی جزوی اور دھندلی جھلک ہیں۔ تاریخ ذہن مطلق کو ظاہر کرتی ہے۔ زبان عقل کی مظہر ہے جو خدا کی بہترین تخلیق ہے۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کا علم اپنے طور پر شخصیت کے ارتقا میں اضافہ کرتا رہتا ہے کیونکہ وہ اسے روح مطلق کو زیادہ بہتر طریقے سے منعکس کرنے کے قابل بناتا ہے۔

انسان فقط روح نہیں۔ وہ جسم کے قالب میں ایک روح ہے اور جسم دنیا کی فلاح کا خواہاں ہے جس طرح کہ روح آخرت کی فلاح کی خواہاں۔ اسلام نے دنیوی فلاح کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا ارشاد ہے:

"کر دنیا سے اپنا حصہ لینا مت بھولو۔" (۲۸: ۷۷)

اس نے ہمیں یہ دعا مانگنا سکھائی:

"اے میرے رب ہمیں دنیا کی بھلائی عطا فرما اور آخرت کی بھلائی۔" (۲: ۲۰۱، ۷: ۱۵۶)

رسول اکرم کا ارشاد ہے:

"جو شخص دنیا کی فلاح چاہتا ہے اسے علم حاصل کرنا چاہیے۔ جو شخص آخرت کی فلاح چاہتا ہے اسے علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو شخص دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح چاہتا ہے اسے علم حاصل کرنا چاہیے۔"

قرآن اور حدیث کے ان احکام کی روشنی میں مفید ہنر سیکھنا بھی اسلام کے نصب العین نواز نصاب کا لازمی حصہ ہے۔ ان مہارتوں اور ہنروں کا انتخاب بہرحال اس نے معاشرے کی ضروریات

کے اعتبار سے انسان کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔

طریق تعلیم

"کیا پڑھا جائے" کا براہِ راست تعلق "کیسے پڑھایا جائے" سے ہے۔ موادِ تدریس کو طریقِ تدریس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تعلیمی عمل کا مرکز نہاں خانۂ دل ہے جس میں طالب علم خود رہتا ہے۔ استاد اس نہاں خانے کا اپنے اثر و رسوخ سے چاروں طرف سے محاصرہ کر سکتا ہے لیکن وہ اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شاگرد خود اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ اس کی نشوونما خود اس کی اپنی خود متحرکی پر منحصر ہے۔ اس خود متحرکی کو تقویت پہنچانے کے لیے نصاب مطالعے، مشاہدے اور تفکر کے لیے مواد مہیا کرتا ہے اور بصارت کو بصیرت سے ہم کنار کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

عینیتی نظامِ تعلیم میں کتاب کے استعمال پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کتاب کا درس ایصالِ علم کا بہترین طریقہ ہے۔ لیکن درس کس طرح دیا جائے؟ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "انبیا کو یہ حکم ہے کہ لوگوں کو ان کے مرتبوں میں رکھیں اور ان کی عقلوں کے بموجب ان سے بات کریں۔ اس سے یہ اصول مرتب ہوا کہ استاد کے لیے لازم ہے کہ اسے شاگرد کی صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ ہو اور یہ کہ وہ انھیں وہی بات بتائے جو اُن کی سمجھ سے بالاتر نہ ہو۔ اگر کوئی بات شاگرد کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے چاہیے کہ استاد سے پوچھ لے۔ اپنی خود متحرکی کو وہ ہرگز نہ دبائے کیونکہ اسی پر اس کی تعلیم موقوف ہے۔ غزالی کے الفاظ میں علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی سوال ہے۔ پس شاگرد کو سوال ضرور کرنا چاہیے۔ اس میں چار آدمیوں کا بھلا ہے۔ خود سوال کرنے والے کا، استاد کا، سننے والے کا اور اس کا جو ان سب سے محبت کرتا ہے۔[۵۳]

لیکن اسے صرف سوال کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ مسائل کو سمجھ لینے اور انھیں یاد کر لینے سے علم میں ملکہ نہیں حاصل ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے زور

---

۵۳ غزالی احیاء علوم الدین۔ اردو ترجمہ مذاق العارفین ج ۱ ص ۱۴۔

دیا ہے کہ "طلبا کو بحث و مناظرے کا عادی بنایا جائے، مسائل علمیہ پر تحقیقی بحثیں ہوں مختلف مضامین پر گفتگو چھڑے اور طلبا اس میں سرگرمی سے حصہ لیں۔ اس طریق تعلیم اور اسلوب درس سے ملکہ بہت جلد پیدا ہوتا ہے"[۵۴]

سوال کرنا اور تحقیقی بحث و تمحیص میں حصہ لینا حصولِ علم کا وہ طریقہ ہے جس کا تعلق شاگرد کی اپنی ذات سے ہے۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ استاد کس طریقے سے عملی حقائق کو شاگرد کے دل میں اتارتا ہے؟ کسی مضمون کو سمجھنے اور اسے دل نشین کرنے کی استعداد رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے اس لیے تعلیم کا بہترین "طریقہ یہ ہے کہ علوم کو رفتہ رفتہ اور تھوڑا تھوڑا ذہن نشین کیا جائے"۔

ابن خلدون نے اس سلسلے میں استاد کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ ہر مضمون کے تین تین دور کرائے۔ پہلے دور میں وہ زیر مطالعہ مضمون کے صرف اصولی مسائل بیان کرے اور شاگرد کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اجمالی طور پر ان کی تشریح کرے۔ حسی مثالوں کے ذریعے مجرد حقائق کو سمجھائے اور پیچیدہ مسائل کو اس مرحلے میں بالکل نہ چھیڑے۔ دوسرے دور میں اس مضمون کی تعلیم پھر از سر نو شروع کرے اور اس مرتبہ تعلیم کا معیار کچھ بلند کر دے۔ اجمال و اختصار کی بجائے شرح و بسط سے مسائل کو سمجھائے۔ ساتھ ہی ساتھ اختلافی مسائل پر روشنی ڈالے اور وجہ اختلاف بھی بیان کرے۔ تیسرے دور میں اس مضمون کی تعلیم پھر سرے سے شروع کرے اور اس مرتبہ کسی مشکل اور مغلق مسئلے کو بغیر تشریح و توضیح اور تنقیح کے نہ چھوڑے۔ ہر مسئلے کو تفصیل کے ساتھ سمجھائے۔ اس کے مضمرات کو عیاں کرے تاکہ شاگرد کی رسائی اور دقیق معانی تک ہو سکے۔ اس طرح ہر مضمون کو تین تین مرتبہ پڑھنے سے اس میں "بڑی گہری نظر پیدا ہو جاتی ہے"، اور شاگرد کو اپنے علم پر عبور حاصل ہو جاتا ہے[۵۵]

کسی مضمون میں "گہری نظر" پیدا کرنے کے لیے ابن خلدون نے دو اور باتیں کہی ہیں، جن کا لحاظ رکھنا استاد کے لیے ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کسی مضمون کو مختلف نشستوں

---

۵۴ مقدمہ ابن خلدون، ص ۵۵۴۔

۵۵ ایضاً ۵۵۸۔

میں نہ پڑھا جائے، درمیان میں وقفہ آجانے سے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، بھول چوک کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔ مختلف اسباق میں ربط و اتصال قائم نہیں رہتا اور ملکہ کا حصول دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے جس کا اقتضا یہ ہے کہ کوئی ایک مضمون مسلسل اور لگاتار پڑھا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دو ایک مضمون ایک ساتھ ہرگز نہ پڑھے جائیں ورنہ شاگرد کو کسی مضمون میں درک حاصل نہیں ہوگا۔ اس صورت میں اس کی توجہ اور قوتِ فہم بٹ جائے گی۔ وہ کبھی ایک مضمون کو چھوڑ کر دوسرے مضمون کی طرف آئے گا اور کبھی دوسرے کو چھوڑ کر پہلے کی طرف اور اس طرح دونوں سے محروم رہے گا۔[۵۶]

پس تعلیم کا مفید ترین طریقہ یہ ہے کہ دو علوم ایک ساتھ نہ پڑھائے جائیں اور نہ کسی ایک علم کو مختلف نشستوں میں پڑھایا جائے۔ ہر علم کے مجوزہ شرائط کے مطابق تین تین دور کرائے جائیں تعلیم کا دار و مدار چونکہ شاگرد کی اپنی خود متحرکی پر ہے، اس لیے درس کے دوران میں سوال کرنے کی عام اجازت ہو۔ نیز بحث و مباحثے کا اہتمام کر کے شاگرد کو کسی رائے کے انتخاب یا کسی بات کا فیصلہ کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ضرورت پڑے تو فکر انگیز سوال کر کے استاد اس فیصلے کی طرف شاگرد کی رہنمائی کرے۔

عینیتی نظامِ تعلیم بالعموم غیر محسوس مجرد (ABSTRACT) حقائق کو دل نشین کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن اسلام نے غیر محسوس مجرد حقائق کے ساتھ ساتھ حقیقت کے اس پہلو کو بھی جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک علم حق کا ذریعہ صرف دل یعنی تفکر اور فطری وجدان ہی نہیں، آنکھ اور کان بھی علم حق کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے کتاب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس نے فطرت کا مشاہدہ کرنے کی بھی بار بار تاکید کی ہے۔ اسی دعوت عام کے مدنظر اقبال کہتے ہیں کہ:

"اسلام کا ظہور عقلِ استقرائی کا ظہور ہے"۔[۵۷]

---

۵۶ مقدمہ ابن خلدون ص ۵۵۹۔

۵۷ اقبال تشکیل الٰہیاتِ اسلامیہ، مترجم سید نذیر نیازی۔ بزم اقبال، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۳

اسلام ٹھوس حقائق کے مشاہدے سے عام کلیے اخذ کرنے پر بھی اتنا ہی زور دیتا ہے جتنا کہ کسی عام کلیے کو ایک خاص واقعے پر اطلاق کرنے پر۔ کلیات سے جزئیات کی طرف بڑھنا اس کے نزدیک کافی نہیں۔ وہ جزئیات سے کلیات کی طرف بڑھنے کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کا طریق تعلیم صرف استخراج (DEDUCTION) پر مشتمل نہیں، جو کلیات سے جزئیات کی طرف بڑھنے کا ایک عمل ہے۔ استخراج کے ساتھ ساتھ استقرا (INDUCTION) بھی اس میں شامل ہے جو جزئی حقائق کے مشاہدے سے عام اصول اور کلیے اخذ کرتا ہے اور جسے وسیع پیمانے پر استعمال کر کے قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں نے سائنس کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ یورپ کی ولادتِ نو استقرائی طریق فکر ہی کی رہین منت ہے۔ اس نے "اسلام سے جو کچھ حاصل کیا اسی سے فائدہ اٹھا کر وہ مسلمانوں پر سبقت لے گیا"[۵۸]

---

۵۸ انگلستان کا مشہور ماہر انسانیات رابرٹ بریفالٹ (۱۸۷۶-۱۹۴۸) اپنی کتاب میکنگ آف ہیومینٹی (لندن ۱۹۳۰) مترجم عبدالمجید سالک بعنوان تشکیل انسانیت (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶) میں لکھتا ہے:

"راجر بیکن نے عربی زبان اور عربی سائنس کا علم حاصل کیا تھا۔ راجر بیکن اور اس کے ہم نام کے متعلق جو بعد کو پیدا ہوا یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ تجربی اسلوب کی ترویج کا سہرا ان کے سر ہے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ مسیحی یورپ کو مسلمانوں کی سائنس اور ان کا اسلوب سکھانے کا ذمہ دار تھا اور وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے تھکتا ہی نہ تھا کہ اس کے معاصرین کے لیے علم صحیح کا واحد ذریعہ صرف عربی زبان اور عربی سائنس ہے۔" (ص ۳۱۳)

"عربوں کے علم ہیئت نے کوئی کوپرنیکس یا نیوٹن نہیں پیدا کیا لیکن انھوں نے جو کچھ کیا اس کے بغیر کوپرنیکس اور نیوٹن پیدا ہو ہی نہ سکتے تھے۔" (ص ۲۹۵) ـــــ ہماری سائنس پر عربوں کا جو احسان ہے وہ چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی زیادہ عربوں کی ثقافت کی ممنون احسان ہے، کیونکہ دراصل سائنس کو اسی ثقافت نے جنم دیا ہے۔ ہم اس سے قبل ثابت کر چکے ہیں کہ دنیائے قدیم "قبل سائنس" کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات و ریاضیات باہر سے درآمد ہوئی تھیں۔ چنانچہ یونانی ثقافت انھیں پورے طور پر کبھی جذب نہ کر سکی اس میں شک نہیں کہ یونانی اپنے علوم کو مرتب کرتے تھے، عمومیت دیتے تھے، نظریات قائم کرتے تھے لیکن ماہرانہ تحقیق و تفتیش، مثبت علم کی فراہمی، سائنس کی باریک بینی، مفصل اور طویل مشاہدات اور تجربی تجسس یہ سب لوازم یونانی مزاج سے قطعاً بعید تھے" (ص ۲۹۶)